فکر اقبال اور تہذیبی مباحث

استفسارات

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

استفسار

السلام علیکم!

گزارش ہے کہ میں تہذیبی تصادم کے معاصر نظریات پر فکر اقبال کی روشنی میں تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ آپ درج ذیل سوالات کے ضمن میں راہنمائی عنایت فرمائیں:

۱- کیا معاصر تہذیبی تصادم اکیسویں صدی میں عالمی امن کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے؟

۲- مابعد ۱۱ر ستمبر کی عالمی تہذیبی صورت حال میں مغرب اور مسلم دنیا کے تعلقات تصادم پر مبنی رہے ہیں یا باہم معاونت اور بقائے باہمی پر؟

۳- ۱۱ر ستمبر کا واقعہ مغرب میں اسلام فوبیا کے رجحان میں کیونکر فروغ کا باعث بنا ہے؟

۴- کیا اکیسویں صدی میں بھی افکار اقبال کی معنویت مسلم ہے؟ اور معاصر عالمی تہذیبی تناؤ اور آویزش کی صورت حال میں علامہ اقبال کی فکر کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

۵- کیا اکیسویں صدی کے تہذیبی تصادم کے بیانیے میں افکار اقبال کے تناظر میں قیام امن اور تعاون باہمی کی خاطر کوئی ایسا عالمی سماجی نظام تشکیل دینا ممکن ہے جو تہذیبوں کے مابین آویزش کا خاتمہ کر کے کرہ ارض کو تمام انسانوں کے لیے یکساں جائے امن بنانے میں مددگار ثابت ہو سکے؟

جویریہ حسن
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اسلامی فکر و تہذیب
یو ایم ٹی۔ لاہور

جواب

سوال ۱:

دورِ جدید میں عالمی سطح پر اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات اور عالمی امن کو جس نظریئے نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ معاصر تہذیبی تصادم کا نظریہ ہے۔ سیموئیل ہنٹن گٹن نے اس نظریئے کی اساس ایسے مباحث اور اصولوں پر رکھی ہے جن کا نتیجہ اقوامِ عالم کی تفریق اور باہمی کشمکش کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ نہ صرف اپنی معروف کتاب The *Clash of Civililzations and the Remaking of New World Order* میں بلکہ بعد کی تصانیف میں بھی سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنے اسی طرح کے نظریات کو میسر دلائل اور اعداد و شمار کے ساتھ محکم کر کے پیش کیا ہے۔ مثلاً سیموئیل ہنٹنگٹن کی آخری کتاب *Who are We? the Challenges to the Nations of America* ہے، جو مئی 2004ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں جب ہنٹنگٹن نے امریکہ کی قومی شناخت کے مفہوم پر گفتگو کی تو اس نے بڑے پیمانے پر ترک وطن کر کے امریکہ آنے والے لوگوں کو امریکی سوسائٹی کے لیے درپیش ثقافتی خطرات بنا کر پیش کیا۔ ان خطرات کے باعث ہنٹنگٹن نے یہ پیش گوئی کی کہ امریکہ کے لوگ مستقبل میں دو حصوں، دو ثقافتوں یا دو زبانوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔[۱]

سرد جنگ کے بعد کے حالات میں دنیا کی عالمی سیاست اور اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات کی توضیح و تشریح کے لیے مفکرین نے کئی نظریات پیش کیے۔ بعض کے مطابق دنیا کی عالمی سیاست غیر مستحکم، کثیر قطبی رقابتوں اور باہمی تنازعات سے عبارت ہو گی جبکہ بعض کے نزدیک اب ریاستی طاقت مسلسل کمزور ہوتی جائے گی جس کے نتیجے میں دنیا میں لاقانونیت اور عمومی سماجی انحطاط کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گا۔ سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب The *Clash of Civililzations and the Remaking of New World Order* میں ان دونوں نظریات کا تجزیہ پیش کیا۔ سرد جنگ کی دہائیوں کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں اس کی روش انتہائی تنگ نظر اور مقابلتاً جمودی نوعیت کی تھی۔ ہنٹنگٹن نے بین الاقوامی سیاست میں روایتی طرزِ فکر سے مختلف راستہ اختیار کیا اور عالمی تعلقات اور اقوامِ عالم کی تاریخ، حال اور مستقبل کے امکانات کو موضوع بناتے ہوئے کئی ایسے زاویوں اور جہات کی طرف اشارہ کیا جو اس سے پہلے اس انداز سے زیرِ بحث نہیں لائی گئی تھیں۔ مثلاً ہنٹنگٹن نے لکھا کہ سرد جنگ کی بعد کی دنیا میں بنیادی اور اصولی سیاسی تقسیم کا مرکز مسائل پیدا کرنے والی اقوامِ عالم کی وہ مختلف سرحدیں ہوں گی جو تہذیبوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں یعنی اب نظریہ یا قومی شناخت کے بجائے، کلچر، ثقافت، دوست اور دشمن کی

تمیز، تعیین، انتخاب یا استرداد کی بنیاد اور معیار قرار پائے گا۔[۲]

اگر چہ عالمی سیاست کے مرکزی کردار ریاستیں ہی ہوں گی لیکن ریاستوں کے درمیان اتحاد کی بنیاد تہذیبی رویے طے کریں گے۔ ایسے ممالک جن میں ایک جیسی ثقافتی اقدار اور وابستگیاں ہوں گی ان میں اتحاد کے نتیجے میں تہذیبی سرحدوں پر تنازعات پیدا ہو سکیں گے۔ اور وہ سرحدیں جہاں تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہوں گی وہاں پر موجود اختلافات پر نئے بین الاقوامی عمل، جسے ہنٹنگٹن نے Kin Country Rallying کہا ہے، کے نتیجے میں دنیا کو نئے خطرات کا سامنا ہوگا۔ یعنی ریاستیں بدستور عالمی سیاست میں اہم کردار ادا کرتی رہیں گی لیکن تہذیبیں بین الاقوامی سیاست کے تجزیہ کی بنیادی اور اصولی اکائی ہوں گی اور جب بھی ریاستیں بین الاقوامی تعلقات میں کوئی کردار ادا کریں گی تو وہ کردار ان کے باہمی تہذیبی اشتراک و اختلاف کی بنیاد پر طے پا رہا ہوگا۔[۳]

ہنٹنگٹن کے مطابق مغرب کے نفوذ اور سیاسی غلبے نے دنیا کے دوسرے حصوں اور غیر مغربی ثقافتوں میں مغرب کے حوالے سے دوری اور باہمی خود وابستگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مغرب کی مقابلتاً کمزور ہوتی ہوئی معاشی اور آبادیاتی طاقت مغرب کی حلیف تہذیبی نمائندہ ریاستوں کی طرف سے مغربی قبضے اور غلبے کے لیے سیاسی چیلنج کے طور پر سامنے آئے گی۔[۴]

ہنٹنگٹن نے ان حالات میں مغربی معاشروں کو متنبہ کیا کہ وہ خارجی چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو اس کی اساسی اقدار اور مفادات کو درپیش ہیں اپنی تہذیب کو متحد کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ مغرب کو اپنے آفاقی ہونے کے تصورات اور اپنی تہذیب و کلچر دوسرے معاشروں کو منتقل کرنے کے عمل پر، جس سے مغرب کے نمونے پر یہ معاشرے بھی ڈھل جائیں، محتاط روش اختیار کرنی ہوگی تاکہ غیر مغربی معاشروں کی طرف سے انہیں غیر معمولی ردعمل کا سامنے نہ کرنا پڑے۔ مغرب کو ان ممالک اور معاشروں میں جو مغربی مفادات کے لیے واضح خطرہ نہیں ہیں مداخلت اور تنازعات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مستقبل میں امن کا قیام باہم حریف تہذیبوں کی نمائندہ ریاستوں کے درمیان طاقت کے توازن پر منحصر ہے۔[۵]

بہت سے مفکرین کے نزدیک مابعد سرد جنگ کی دنیا کی صورتگری کرنے والی مختلف قوتیں اور رجحانات دنیا کو مثبت طریقے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان میں ترقی پذیر دنیا کے کچھ حصوں میں تیز رفتار معاشی جدیدیت، بین الاقوامی انحصار باہمی یا عالمگیریت میں اضافہ اور جمہوری سیاسی اداروں کا فروغ شامل ہیں۔[۶] کئی مفکرین کے نزدیک یہ تینوں رجحانات عالمی سطح پر اچھے مستقبل کے غماض ہیں جس میں

امن، خوشحالی اور باہمی تعاون فروغ پذیر ہوں گے۔ جدیدیت اور عالمگیریت دونوں معاشی بہبود میں اضافہ کرتے ہیں اور ایک محفوظ اور پرامن دنیا کی تشکیل کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ بلکہ عالمگیریت مختلف تہذیبوں میں ارتباط کے امکانات بھی پیدا کرتی ہے:

> Globalization is now progressively blarring characteristic between different civilizations. It is globalization which selects various characterstics of civilizations making them a sort of symbiosis.[7]

بڑھتی ہوئی تجارت اور سرمایہ کاری کا باہمی فروغ ریاستوں کے رویوں میں امن افزا اثرات مرتب کرتے ہیں۔تصورات، افکار اور اطلاعات کے فروغ سے لوگوں میں باہمی افہام و تفہیم بڑھتی ہے۔[8] اس سے اقدار اور مفادات میں ارتکازیت پیدا ہوتی ہے۔ جمہوریت کے فروغ سے توسیع پسندانہ اور بے ہنگم خارجہ پالیسیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور ایسے مختلف معاشروں میں باہمی اعتبار بڑھتا ہے جو ایک جیسے سیاسی اصولوں پر فروغ پذیر ہو رہے ہوں۔لیکن ہنٹنگٹن کا مخصوص نظریہ ان دلائل کے بالکل برعکس نتائج اخذ کرتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے نزدیک جدیدیت، عالمگیریت اور جمہوریت کا عمل امن اور تعاون کو فروغ دینے کی بجائے تہذیبی کشمکش کی بنیاد رکھتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے مطابق جدیدیت اور مغربیت دو مختلف حقائق ہیں۔ کوئی معاشرہ اپنی بنیادی اقدار کو بدلے بغیر بھی جدید ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ تیسری دنیا کی جدیدیت مغرب مخالف یا مغرب دشمنی کی اساس کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ جدیدیت کے عمل سے وسائل میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر یہ ایک ایسے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل میں خرچ ہوتے ہیں جو مغرب مخالف ہوتے ہیں۔[9]

ہنٹنگٹن کے مطابق جب ریاستیں ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں تو ان کے باہمی انحصار کے بڑھنے سے ان میں مرکزیت یا تعلقات کی قربت نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کے بجائے ان کے درمیان اختلافات مزید نمایاں ہوتے ہیں۔ اور جب اس طرح کے باقاعدہ روابط پیدا ہوں گے تو مختلف اقوام ایک دوسرے کی متضاد اقدار سے آگاہ ہوں گی جس سے ان میں تصادم اور تنازعہ کا پیدا ہونا یقینی عمل ہے۔لہٰذا ریاستوں کا ایک دوسرے پر انحصار کرنا مزاحمت اور نفرت کو فروغ دے گا خصوصاً اس وقت جب کسی ایک معاشرے کی اقدار کسی دوسرے معاشرے میں نفوذ کر رہی ہوں جن کے لیے وہ اقدار ناموافق اور ناقابل قبول ہوں۔ اسی وجہ سے ایک دوسرے پر انحصار کرنے سے ریاستیں اپنے سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو نیا رخ دیں گی اور جہاں ممکن ہوگا یہ تعلقات ان ریاستوں کے ساتھ قائم ہوں گے جن کے ساتھ بنیادی ثقافتی اقدار مشترک ہیں اور آنے والے سالوں میں معاشی انحصار باہمی ایسی تہذیبوں میں ہی قائم ہو سکے گا جبکہ بین التہذیبی تبادلہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سطحی ہوتا چلا جائے گا اور مختلف اقوام عالم کے درمیان تہذیبی اختلاف

کے باعث ردعمل کے رویوں اور ایک دوسرے کے مابین اقدار پر مبنی کشمکش پیدا ہونے کے نتیجے میں بین التہذیبی تبادلے کے امکانات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتے چلے جائیں گے۔[10]

عالمی سطح پر جمہوریت کے اثرات کیا ہوں گے اور جمہوری رویوں کے فروغ پذیر ہونے سے دنیا کی مختلف اقوام کس طرح متاثر ہوں گی اس حوالے سے بھی ہنٹنگٹن کا نقطہ نظر مغربی اور غیر مغربی دنیا کے لیے بالکل مختلف ہے۔ ہنٹنگٹن کے نزدیک جمہوریت کے ساتھ مشترکہ وابستگی کے نتیجے میں مغربی ممالک میں تو باہمی دوستانہ تعلقات فروغ پذیر ہوں گے لیکن غیر مغربی ممالک میں جمہوریت کے فروغ سے مذہبی بنیاد پر مسلم یا مقامی ثقافتوں کے لیے اقتدار تک پہنچنے کے راستے کھل جائیں گے۔ یہ گویا ایسی اقدار کی پیروکار ہوتی ہیں جو مغربی جمہوری معاشروں کی اقدار سے بالکل مختلف ہیں۔ لہذا بعد میں ایسے لوگ اقتدار میں آ کر ایسی خارجہ پالیسیاں اختیار کرتے ہیں جس کے نتیجے میں مغرب کے ساتھ تنازعے پیدا ہونے لگتے ہیں۔[11]

یعنی جدیدیت اور جمہوریت جیسے جدید تصورات جن کو مغربی دنیا کے کئی مفکرین بین الاقوامی ہم آہنگی کی بنیاد سمجھتے ہیں ہنٹنگٹن انہیں بھی بین الاقوامی تنازعات اور انحرافات کا سبب اور سرچشمہ قرار دیتا ہے۔[12]

بین الاقوامی سطح پر پیدا ہونے والا ہر وہ رویہ جو اس کے نزدیک مغرب مخالف ہے ہنٹنگٹن اسے رد کرنا لازمی سمجھتا ہے۔ مثلاً ہنٹنگٹن اسلامی دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو قوت کا سرچشمہ بھی قرار دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسے مسلم دنیا کی کمزوری کی بنیاد بھی بناتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی دنیا کی امیر ترین ریاستیں جو تیل کی بڑی برآمد کنندگان ہیں انہیں بھی جب سے تیل کی قیمتیں گرنا شروع ہوئیں برآمدی ریونیو میں کمی کا سامنا ہے۔[13] خلیجی جنگ کے دوران اسلامی دنیا حتیٰ کہ عراق پر بھی مغرب کی وسیع فوجی برتری سامنے آئی جہاں عراق امریکہ اور اس کے اتحادی قوتوں کے سامنے معمولی سی مزاحمت بھی نہ کر سکا۔ اگرچہ ہنٹنگٹن یہ بات کہنے میں تو درست ہے کہ مغرب حالیہ سالوں کے دوران اکثر و بیشتر اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں تنازعات میں الجھا رہا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ ان تنازعوں میں مغرب کے اسلامی حریف نہیں بلکہ خود مغرب ہی غالب رہا ہے۔ ہنٹنگٹن کی منفی سوچ اور نقطہ نظر کا اندازہ اس کی کتاب کے خاتمے سے ہوتا ہے جہاں وہ عالمگیر جنگ کی پیغمبرانہ انداز میں پیشن گوئی کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ جنگ ایسی ریاستوں کے درمیان ہوگی جو تہذیبی سطح پر ایک دوسرے کے مقابلے میں ہیں۔ حیران کن حد تک یہ خوفناک جنگ ان رخنہ سرحدوں پر ہی شروع ہوگی جن کی نشاندہی ہنٹنگٹن نے مختلف تہذیبوں کے درمیان کی ہے بلکہ اس جنگ کا آغاز چین اور ویتنام کے درمیان ہوگا جو ایک ہی تہذیب کے حامل ہیں اور یہ تنازعہ جنوبی چین کے سمندر پر کنٹرول کے لیے شروع ہوگا۔ یعنی ہنٹنگٹن یہ نظریہ بیان کرتے ہوئے اختتام

پر اپنے بنیادی نقطہ نظر سے بھی ہٹ جاتا ہے کہ مستقبل میں پیدا ہونے والے عالمی تنازعے کو کسی تہذیبی اساس کے بجائے معاشی مفادات کی اساس پر پیش کر کے آگے بڑھاتا ہے۔[۱۴]

ہنٹنگٹن کے مندرجہ بالا نظریات اور تصورات نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا میں مایوسی اور فرسٹریشن کو جنم دیا جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ دنیا آج بھی باہمی تنازعات میں الجھی ہوئی ہے۔ ہنٹنگٹن کا تہذیبی تصادم کا نظریہ جو باہم مخالف اور غیر موافق تہذیبوں کے درمیان ہوگا ایک احساس عدم تحفظ پیدا کرتا ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ تبدیلی کا وہ دور جس سے اب دنیا گزر رہی ہے اکثر و بیشتر غیر یقینیت اور مایوسی کو جنم دیتا ہے۔ لہذا ایسے دور میں مایوسی اور قنوطیت کی باتیں کرنے والے مفکرین کو فوراً قبول عام مل جاتا ہے۔ تاہم موجودہ عالمی دنیا میں مخفی مختلف کارفرما عوامل مثلاً جدیدیت، ایک دوسرے پر انحصار باہمی اور جمہوریت کے رجحانات کو فروغ دے کر اس قنوطی منظر نامے کو بدلا جا سکتا ہے۔ تاہم معاملات کی تفہیم اور ابلاغ کے حوالے سے انداز فہم اور انداز نظر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر پالیسی ساز اور عوام اپنی توقعات اور لائحہ عمل کا انحصار ہنٹنگٹن کے قنوطی، مایوس کن اور تنازعات افزا نظریات پر رکھیں گے تو مستقبل میں مثبت تعمیر کے امکانات بہت کم ہیں۔ تاہم سماجی دانشوروں کے لیے یہ ایک امتحان ہے کہ وہ ذمہ داری کے ساتھ حقائق کا ایسے انداز سے تجزیہ کریں جس سے ایک پرامن دنیا کی تشکیل ممکن ہو سکے۔

یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ معاصر تہذیبی تصادم کا نظریہ صرف سیاسی یا معاشی عوامل کی ہی بنیاد پر فروغ پذیر نہیں ہوا بلکہ اس نظریئے کے پیچھے ایک طویل علمی، فکری اور تہذیبی پس منظر موجود ہے جس کا واضح اشارہ ہمیں ایڈورڈ سعید کی تحریروں میں ملتا ہے۔ استشراق کی روایت پر تنقید کے حوالے سے سعید کا نام حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مطابق استشراق ان غلط اور جھوٹے تصورات کا نام ہے جو مشرق کے بارے میں مغربی رویے میں چھپے ہوئے ہیں۔ اپنی کتاب *Orientalism* میں ایڈورڈ سعید نے دعوی کیا کہ مغرب میں عرب اسلامی دنیا اور ان کے کلچر کے بارے میں مرکزیت کا حامل تعصب پایا جاتا ہے۔ جس کا بنیادی مقصد مغرب کو مشرق پر فائق ثابت کرنا ہے چاہے اس کے حقائق کتنے ہی مسخ کرنے پڑیں۔ اس کے مطابق ایشیا اور قرون وسطی کے بارے میں مغربی کلچر میں ایک طویل اور جھوٹے افسانوی تصورات پر مبنی روایت نے یورپ اور امریکہ کی نوآبادیاتی اور سامراجی سرگرمیوں کے لیے جواز فراہم کیا۔ ۱۹۸۰ء میں ایڈورڈ سعید نے اس حوالے سے مغرب کے پسماندہ اور نامکمل فہم کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اس نے کہا جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے یہ کہنا بہت ہی غلط بیانی کے مترادف ہوگا کہ مسلمان اور عرب صرف تیل بیچنے والے لوگ یا چھپے ہوئے دہشت گرد ہیں۔ بلکہ اب تو عرب مسلم زندگی کی تفصیلات

سے امریکہ اور برطانیہ کے ایسے لوگ بھی آگاہ ہونے لگے ہیں جن کا پیشہ ہی عرب دنیا کے بارے میں دنیا کو غلط اطلاعات فراہم کرنا ہے۔ مغرب میں اسلامی دنیا کے بارے میں ایسی ظالمانہ اور مسخ شدہ تصویر کشی کا ایک ایسا سلسلہ ملتا ہے جو عالم اسلام کو دوسری دنیا کی عسکری یلغار کے لیے موزوں بنا کے پیش کرتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق مشرق کے بارے میں لکھی جانے والی مغربی تحریریں مشرق کو عقل دشمن، کمزور اور تانیث شدہ جنس کے طور پر پیش کرتی ہیں جس کے مقابلے میں مغرب صاحب عقل، صاحب دانش، مضبوط اور رجولیت کا حامل ہے۔ یہ وہ تضاد ہے جو مشرق اور مغرب کے درمیان درکار فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں جب یہ کتاب پہلی دفعہ شائع ہوئی تو دنیا میں اوپیک کے بحران کی یادیں تازیں تھیں۔ ایڈورڈ سعید نے اسے دلیل کے طور پر بیان کیا کہ یہ رویہ اب بھی مغربی میڈیا اور اہل علم میں عام ہے۔ *Orientalism* میں اس نے اپنا بنیادی نظریہ بیان کرنے کے بعد اس کی تائید میں مغربی کتب سے اس کی بہت سی مثالیں بھی فراہم کی ہیں۔ [۱۵]

یعنی یہ ایک مثال ہے جو ایڈورڈ سعید کے حوالے سے یہاں پیش کی گئی ہے کہ علمی اور تہذیبی تفہیم کی سطح پر شعوری کوشش سے مشرق اور مغرب کے درمیان یہ بعد اور دوری پیدا کی گئی۔

سوال نمبر ۲

نائن الیون کے بعد کے واقعات کو عالمی تہذیبی تناظر میں مشرق اور مغرب، یعنی مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان تعلقات کو باہمی معاونت اور بقائے باہمی پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ نائن الیون کے بعد عالمی سطح پر جس طرح کے تصادم اور باہمی جنگ و جدل کی فضا رہی ہے اس سے عالمی بقائے باہمی کی فضا استوار کرنے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ نائن الیون کے بعد کے حالات نے دنیا کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اطلاعات کے بہاؤ (Information Superhighway) میں نائن الیون کے زیر اثر جو معلومات دنیا بھر میں پھیلیں ان سے بقائے باہمی کی فضا استوار نہیں ہو سکتی تھی۔ [۱۶] حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ نائن الیون کے بعد پیش آنے والی صورت حال کا سنجیدہ علمی سطح پر تجزیہ کیا جاتا اور ان عوامل کا سدِ باب کیا جاتا جو مشرق اور مغرب کے درمیان آویزش یا بعد اور دوری کا سبب بن رہے ہیں۔ لیکن اس طرح کی کوئی سنجیدہ کوشش کی بجائے باہمی تصادم پر مبنی فضا پیدا ہو گئی۔ جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت دنیا ایک خلفشار کی فضا کا شکار ہے۔ [۱۷] کیونکہ تاریخی پس منظر اس امر کی توثیق کرتا ہے کہ مغرب میں عالمی سطح پر معاونت اور بقائے باہمی کو اصول بنا کر آگے بڑھنے کی بجائے مشرق اور دیگر ممالک پر تفوق کو اصول بنایا گیا۔ [۱۸]

سوال نمبر ۳

نائن الیون کے واقعہ کے بعد مغرب میں اسلام فوبیا کے رجحان کو تقویت ملی۔ کیونکہ مغرب کے نائن الیون کے واقعہ سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ اسلامی دنیا کی طرف سے مغرب کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملے کے بعد ۲۰ نومبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے چنیدہ چالیس سکالرز نے اپنے دستخطوں کے ساتھ امریکی حکومت کو خط لکھا کہ عراق کے خلاف جدوجہد کی جائے اور عراقی اپوزیشن کو ہر طرح کی عسکری اور مالی مدد فراہم کی جائے۔ ان اہل دانش میں سرفہرست فرانسس فوکویاما ہے۔ مغربی دنیا میں اسلام فوبیا کے رجحان پیدا ہونے اور اس کے خلاف مغربی اہل دانش کے ممکنہ ردعمل کی صورت حال کی عکاسی فرانسس فوکویاما کی نیویارک ٹائمز میگزین کی ۱۹ فروری ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں تحریر سے ہوتا ہے جس میں اس نے لکھا:

> War is the wrong metaphor for the broader struggle since wars are fought at the full intensity and have clear beginnings and have endings. Meeting with the jihadist challenge is more of a long twilight struggle whose core is not military campaign but a political contest for the hearts and minds ofordinary Muslims around the world.

سوال نمبر ۴

۲۱ ویں صدی میں افکار اقبال کی معنویت مسلم ہے۔ ایک ایسے عالمی نظام کی تشکیل جس میں معاصر عالمی تہذیبی تناؤ اور آویزش کم ہو اور مسلم اور مغرب دنیا کے تعلقات بہتر ہوں، فکر اقبال بنیادی کردار ادا کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حوالے سے لکھا ہے کہ ہمارے نظام کے بنیادی اصولوں یا اس کے ڈھانچے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمارے لیے اجتماعی سطح پر کسی جمودی رویے کا جواز فراہم کر سکے۔ بلکہ مسلم دنیا کو تو معاصر چیلنجز کو پیش نظر رکھتے ہوئے گہری فکر اور تازہ تجربے سے لیس ہو کر جرات مندانہ انداز سے عالمی سطح پر تشکیل جدید کے کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔ تاہم تشکیل جدید کا زندگی کے موجودہ حالات کے مطابق ہونا ایک بہت ہی سنجیدہ معاملہ ہے۔

علامہ اقبال نے لکھا کہ اس کے لیے انسانیت کو ان تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کی روحانی نجات کا راستہ اور منہج اور ایسے عالمگیر نوعیت کے روحانی اصول جو روحانی بنیادوں پر انسانی معاشرے کی نشوونما کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید یورپ نے اپنی لیے جو نظام تشکیل کر رکھے ہیں ان کی بنیاد عقل محض پر ہے مگر عقل محض پر مبنی کوئی بھی نظام اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ کسی عظیم مقصد کے لیے

حقیقی اور زندہ لگن پیدا کر سکے۔ وہ حقیقی لگن ذاتی احساسات سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص فکر نے انسان کو بہت کم متاثر کیا ہے لیکن مذہب نے انسانوں کو ہمیشہ زندگی کی طرف اٹھایا ہے۔ یورپ کی مثالیت پسندی اس کے لیے کبھی زندہ عنصر نہیں بن سکتی جس کے نتیجے میں ان کی بگڑی ہوئی خود غرضی ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والی ان جمہوریتوں کی صورت میں اپنا اظہار کر رہی ہے جس کا واحد مقصد امیر کے فوائد کے لیے غریب کا استحصال ہے۔ اس امر کی تائید یورپ کے اہل علم بھی کرتے ہیں کہ یورپی معاشرے میں ہونے والی ترقی کا مزاج اس امر کا ثبوت ہے کہ تمام علمی اور سائنسی ترقی کو مادی ترفع کے لیے استعمال کیا گیا اور اس کے روحانی اور اخلاقی پہلو کو کلیتا نظر انداز کر دیا گیا۔

Science seemed independent from ethical and moral discourse. Many shared the perception that science and morality are independent.[19]

علامہ کے نزدیک آج کا یورپ انسان کی اخلاقی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کے برعکس ایک مسلمان وحی کی بنیاد پر ایسے کئی تصورات رکھتا ہے جو زندگی کی گہرائیوں میں کارفرما ہیں اور اپنی بظاہر خارجیت کو داخلیت میں بدل سکتے ہیں۔ اس کے لیے زندگی کی روحانی اساس ایمان کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک عام آدمی بھی اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے۔ اسلام کے اس بنیادی نظریے کی رو سے ایک عام انسان کے لیے کسی نئی وحی کی حجیت باقی نہیں رہی۔ مسلم دنیا کو روحانیت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے آزاد اور نجات یافتہ قوم ہونا چاہیے۔ قرون اول کے وہ مسلمان جنہوں نے قبل از اسلام ایشیا کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی انہیں ایسے حالات درپیش نہیں تھے کہ وہ اس بنیادی نظریے یعنی اسلام کے تصور عقیدہ ختم نبوت کی معنویت اور اہمیت کو جان سکتے۔ آج کے مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی اس اہمیت کو سمجھیں اور بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی از سرِ نو تشکیل کریں اور اسلام کے اس مقصد کو حاصل کریں اس کی تفصیلات اب تک ہم پر پوری واضح نہیں ہیں لیکن دنیا کو اس منزل کی ضرورت ہے جسے ہم روحانی جمہوریت کا نام دے سکتے ہیں۔[20]

سوال نمبر ۵

اکیسویں صدی کے تہذیبی تصادم کے بیانیے میں افکار اقبال کے تناظر میں قیام امن اور تعاون باہمی کے لیے ایسا عالمی سماجی نظام تشکیل دیا جانا جو تہذیبوں کے مابین آویزش کا خاتمہ کر کے کرہ ارض کو تمام انسانوں کے لیے یکساں جائے عمل بنانے میں مددگار ثابت ہو سکے کچھ ایسے بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے پر مبنی ہے جن کے بغیر تہذیبی تصادم کو تہذیبی بقائے باہمی میں نہیں بدلا جا سکتا۔ ان میں بنیادی تقاضے اقوام

عالم کے درمیان برابری کی سطح پر تعلقات، رواداری، اقوام کے تشخص کا احترام، بانیان مذہب اور مذہبی شعائر کا احترام، جمعیت آدم، کائنات کی روحانی تعبیر اور عالمی انسانی معاشرے کا قیام ہیں۔ کیونکہ ان تقاضوں کو پورا کیے بغیر کوئی بھی سماجی، معاشرتی یا ثقافتی ترقی انسانی بقا نہیں بلکہ آویزش اور عدم ہم آہنگی کو فروغ دے گی۔

> Racial and ethnic conflicts can only be brought to an end by restoring respect for all human rights, including those norms protecting equality and non-discrimination, and percepts of international humanitarian laws.[21]

یعنی جب تک ان بنیادی تقاضوں کو پورا نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ایک ایسے معاشرے کا قیام خواب ہوگا جس میں فرد کے حقوق ،انسانیت کے احترام اور تہذیبوں کی بقا کی کوئی گنجائش موجود ہو۔ بصورت دیگر جدیدیت اور تکثیریت کے رجحانات بھی معاشرے کو ہم آہنگی سے مزید دور ہی کریں گے۔ [۲۲] علامہ بنیادی طور پر اس معاشرے کے قیام کے ذمہ داری ملت اسلامیہ کی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانیت کی فلاح ایک عالمی معاشرے کے قیام ہے۔ اس عالمی معاشرے کا بنیادی تقاضا قوموں کی خود مختاری کا احترام ہے۔ بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے حامی کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی خود مختاری کے بغیر بین الاقوامی ریاست کا قیام مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر ایک ہم آہنگ قوم کی تشکیل مشکل ہے۔ قوموں کی اقدار، روایات اور ثقافت کا احترام وسیع مشترک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ [۲۳] علامہ اسلام کو اس منزل کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ علامہ نے لکھا کہ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہ نگاہ سے ذریعہ نجات ہو سکتی ہے۔ جبکہ دیگر اقوام کی فتوحات اور بین الاقوامی روابط کی تاریخ اس سے مختلف منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ [۲۴] تاہم علامہ دوسری اقوام کے مثبت کردار کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ علامہ کے مطابق مغرب کے وہ لوگ جن کی سوچ ان کی انسانی فطرت کے گہرے مطالعے پر مبنی ہے ان کا سیاسی شعور، متانت اور مستقل مزاجی اس میں مدد ومعاون ہو سکتی ہے۔ [۲۵]

حوالہ جات و حواشی

1- Samuel P. Huntington, *Who Are We? The Challenges to America's National Identity*, Simon and Schuster, NY, USA, 2004, p.557

2. Samuel P. Huntington, *The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order*, Touchstone, Rochefeller Center, 1230 Avenue of the America, NY, USA, 1996, pp.207-8, 246

3- Ibid, pp.217, 272-92

4- Ibid, pp.102-3, 116

5- Ibid, pp.232-5

6- Nathan Gardels, Nicolas Berggruen, *Renovating Democracy: Governing in the Age of Globalization in Digital Capitalism*, University of California Press, 2019, p.187

7- Mehdi Mozaffari, *Globalization and Civilization*, Routledge, 2002. p.26

8- Salivia Federic, *Enduring Western Civilization: The Construction of the Concept of Western Civilization and its 'Others'*, Praeger, 1995, p. 132.

9- Ibid, pp.76, 116, 125

10- Ibid, pp.73, 92-3

11- Ibid, pp.93-6

12- Ibid, pp.183, 198

13- Ibid, pp.251-9, 261

14- Ibid, pp.313-6

15- Edward Said, *Orientalism, Routledge and Kegam Paul*, London, 1978, pp.329-52

16- Ronald J. Deibert, *Parchment, Printing and Hypermedia: Communication in World Order Transformation*, Columbia University Press, 1997, p. 114

17- Ramses Amer, Ashok Swaim, *The Security Development Nexus: Peace, Conflict and Development*, Anthem Press, 2013, p. 137, 161

18- Rashid Khalidi, *Sowing Crisis,* Ch-III:The Middle East and the International System, Beacon Press, 2009.

19- R. Von Schomberg, *Science, Politics and Morality*, Springer Science and Business Media, 2013, p. 4

20. Allama Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Iqbal Academy Pakistan, Lahore p.152

21. Halger P. Hestemeyer, *Coexistence, Cooperation and Soliderity*, Martinus Nijhoff Publishers, 2011, p. 648

22. Prakash Shah, *Legal Pluralism in Conflict*, Psychology Press, 2005, p. 173-5

23. Carmen E. Pavel, *Divided Sovereighty*, Oxford University Press, 2015, p. 171

24. Frank Jacob, Timothy Demy, *War and the Humanities*, Ferdinand Schoningh, 2019.

۲۵۔ لطیف احمد خان شیروانی، حرف اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد،۱۹۸۴ء، ص۱۵۳۔